منور وادیوں کا پھول

(ڈاکٹر ضیاء الرحمن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی روشن شخصیت پر ایک تاثراتی تحریر)

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر صباح الدین اعظمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

library@mohaddis.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

منور وادیوں کا پھول

(ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی روشن شخصیت پر ایک تاثراتی تحریر)

دین حق کی تلاش:

یہ گذشتہ صدی کی پانچویں دہائی کا بلریا گنج ہے۔ اعظم گڑھ کا ایک چھوٹا سا خوابیدہ قریہ۔ چند ہزار نفوس کی آبادی۔ فرقہ پرستی اور طبقاتی کشمکش سے دور۔ سادہ دیہی ماحول۔ چند مساجد، ایک یا دو مندر، ایک دھرم شالہ، ایک مڈل اسکول اور ایک دینی مکتب۔ یوں تو اس گاؤں میں سالوں سے کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے لیکن ادھر کچھ عرصے سے ایک نئی بات یہ ہوئی ہے کہ یہاں تحریک اسلامی کی فکر نے جڑ پکڑ لی ہے اور جناب حکیم محمد ایوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی قیادت میں تحریک اسلامی کے شجر کی آبیاری ہورہی ہے۔

ایک خوشحال ہندو گھرانے کا کمسن نوجوان۔ نام بانکے لال۔ عمر پندرہ، سولہ سال۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ بڑے لاڈ و پیار سے پرورش ہوتی ہے۔ والد کلکتہ میں کاروبار کرتے ہیں۔ مالی استحکام کی وجہ سے برادری میں چودھری کہے جاتے ہیں۔ گھر میں آسودگی ہے۔ بانکے لال گاؤں کے مڈل اسکول سے پڑھائی مکمل کر کے شہر اعظم گڑھ کے مشہور شبلی انٹر کالج میں داخلہ لیتے ہیں اور شہر ہی میں قیام کرتے ہیں۔ حالانکہ گاؤں کے اکثر ہم عمر لڑکے کئی کلومیٹر پیدل چل کر مالتاڑی اسکول میں پڑھنے جاتے ہیں۔ آسودہ حال باپ کو گوارہ نہیں کہ لاڈلا بیٹا پیدل اسکول جائے اس لئے اس کو پڑھنے کے لئے شہر بھیج دیا ہے۔ پندرہ سولہ سالہ نوجوان کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔ اپنے آبائی مذہب کا مطالعہ ذہن میں سوالات کو جنم دیتا ہے۔ سچائی کی جستجو ہوتی ہے۔ اس جستجو کی تلاش کہاں پہنچاتی ہے خود ان کی زبانی سنتے ہیں۔

''۱۹۵۹ء میں میری عمر کوئی پندرہ سولہ سال رہی ہوگی۔ایک عزیز دوست ماسٹر جنید صاحب نے کہا کہ تم گرمی کی چھٹیوں میں بلریا گنج آئے ہو (میں اس وقت شبلی کالج اعظم گڑھ میں زیر تعلیم تھا) چلو حکیم محمد ایوب صاحب سے ملاقات کرتے ہیں۔جنید صاحب کے اصرار نے مجھے ان کے مطب پہنچا دیا۔جنید صاحب نے میرا تعارف کرایا اور عرض کیا کہ ان کو ہندی میں اسلام سے متعلق کوئی کتاب پڑھنے کے لئے دیں۔محترم حکیم صاحب نے ایک چھوٹی سی کتاب ستیہ دھرم کیا دی کہ آسمان اور زمین کے خزانے بھی ہیچ لگنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جس شخص کو اللہ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔'' (مقدمہ تذکرہ حکیم محمد ایوب)

بلاشبہ حق کی تلاش نے اس کم سن نوجوان کے سینے کو ہدایت کے لئے کھول دیا۔ذرا وقت لگا۔کچھ مدت تک جستجو کا سلسلہ جاری رہا۔کالج کے کئی اساتذہ سے رجوع کیا۔اپنے آبائی مذہب سے اسلام کی حقانیت کا تقابلی جائزہ لیا۔بالآخر حق کی جیت ہوئی اور کم سن نوجوان نے اسلام کی حقانیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اس کا نام رکھا گیا۔''امام الدین''

بانکے لال سے امام الدین کا سفر ایک جستجو کا سفر ہے۔ایک ایسے نوجوان کی داستان ہے جسے حق کی تلاش ہے۔جس کے ذہن میں بہت سارے سوالات ابھرتے ہیں۔اسے اپنے سوالات کے جوابات چاہیے۔اس تلاش میں کچھ روشنی کے مینار آتے ہیں جو اس نوجوان کو راستہ دکھاتے ہیں۔اس روشنی میں نوجوان نے حق کا راستہ تلاش کیا ہے۔ہدایت کی راہ اس کے جستجو کا حاصل ہے۔

حق کے اعلان اور روایات سے بغاوت کے بعد کسی کو پھولوں کی سیج نہیں ملتی۔سچ کا راستہ اپنا کر آگ کے دریا سے گزرنا پڑتا ہے۔یہ تپتی ریگ زاروں کا سفر ہے۔نوجوان امام الدین کو بھی ان مراحل سے گزرنا پڑا۔اہل خانہ نے جلد ہی تبدیلی محسوس کر لی۔گھر کے حالات سازگار نہ رہے۔ماں نے پیار کی دہائی دی۔باپ کو اکلوتے بیٹے کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ستانے لگا۔بہنوں نے جذباتی دباؤ ڈالا۔کھانا پینا چھوڑ دیا کہ ہماری زندگی چاہتے ہو تو واپس آ جاؤ۔جب جذباتی حربے کارگر نہ ہوئے تو سختیاں شروع

کردیں۔ ابتلاء وآزمائش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایذاء رسانیاں بھی ہوئیں، زبانی طعنے بھی سہنے پڑے۔ جب کوئی کامیابی نہ ملی تو تھک ہار کر آریہ سماج کے لوگوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اللہ کی قدرت کہ امام الدین ان کے چنگل سے بچ نکلے۔ لوٹ کر بلریا گنج واپس نہیں آئے، کسی نامعلوم مقام پر روپوش ہوگئے۔ اہل خانہ کی مجبوری تھی کہ اب کس سے گلہ کریں اور کس پر غصہ اتاریں۔ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ لیکن تلاش بھی جاری رہی۔

اب اس داستان کا اگلا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ امام الدین آریہ سماج والوں کے چنگل سے بچ کر نکلے تو ان کے خیر خواہوں نے مقامی حالات کو دیکھتے ہوئے انھیں اعظم گڑھ سے دور کسی ایسی جگہ بھیجنے کا فیصلہ کیا جہاں وہ اہل خانہ اور آریہ سماج والوں کی پہنچ سے باہر ہوں۔ نہایت رازداری سے انھیں تحریک اسلامی کی مشہور درسگاہ اسلامی رامپور بھیج دیا گیا۔ لیکن جلد ہی اہل شر نے اس جگہ کا سراغ لگالیا۔ مجبوراً وہاں سے نکلنا پڑا۔ ضلع بدایوں کا چھوٹا سا قصبہ ککرالہ ان کا اگلا ٹھکانا تھا۔ جہاں کی درسگاہ اسلامی ان کا مسکن بنی۔ لیکن یہ پناہ گاہ بھی جلد چھوڑنی پڑی۔ بالآخر جنوبی ہند کی مشہور درسگاہ جامعہ دارالسلام عمرآباد کا ٹھکانہ تلاش کیا۔ یہاں یہ اطمئنان تھا کہ اہل خانہ اور آریہ سماج والوں کے لئے اتنی دور پہنچنا آسان نہ ہوگا۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد میں ان کا نام رکھا گیا۔ ضیاء الرحمٰن۔ چونکہ اعظم گڑھ سے تعلق تھا اس لئے نسبت بھی نام میں شامل ہوگئی۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی۔ امام الدین سے ضیاء الرحمٰن کا سفر آزمائش اور ابتلاء کا سفر ہے۔ جہاں اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ بھی ہے اور حق پر ڈٹے رہنے کا عزم بھی۔ یہ عزیمت کی داستان ہے۔ ایک کانٹوں بھرا سفر۔ لیکن مسافر کو یقین ہے کہ یہی سیدھا راستہ ہے اور اسی پر چل کر کامیابی ملنے والی ہے۔

دارالسلام عمرآباد پہنچ کر نوجوان ضیاء الرحمٰن کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا۔ سکون ہوا تو اطمئنان سے پڑھنے لکھنے کا موقعہ ملا۔ وہاں کے مشفق اساتذہ اور ذمہ داران نے بھرپور تعاون کیا اور کسی بھی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ادھر وطن میں اہل خانہ مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ شریر عناصر بھی رفتہ رفتہ خاموش ہوگئے۔

ماں کا صدمے سے براحال۔ غصہ کی جگہ غم نے لے لی۔ دارالسلام عمرآباد میں پانچ سال گزارنے کے بعد ضیاء الرحمٰن صاحب کے دل میں وطن کی یاد ستانے لگی۔ ماں کی محبت نے جوش مارا اور انھوں نے وطن آنے کا ارادہ کیا۔ وطن واپسی کی داستان دلچسپ اور جذبات سے پر ہے۔ ضیاء الرحمٰن صاحب اعظم گڑھ شہر پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ بلریا گنج، اعظم گڑھ شہر سے پندرہ کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ رات میں شہر سے گاؤں جانے کے لئے کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ گمان ہے کہ پروگرام بناتے وقت یہ طے کیا ہوگا کہ رات میں ریلوے اسٹیشن سے دارالمصنفین چلے جائیں گے اور پھر وہاں سے صبح ہونے کے بعد بلریا گنج کا سفر کریں گے۔ مولانا ابوالبقاء ندوی صاحب (جماعت اسلامی کے قدیم رکن اور جامعۃ الفلاح کے سابق ناظم) اس وقت دارالمصنفین سے منسلک تھے اور وہیں ان کا قیام بھی تھا۔ ندوی صاحب فجر کی نماز کے لئے باہر نکلے۔ دروازے پر کڑکڑاتی سردی میں شیروانی پہنے ہاتھ میں اٹیچی لئے ایک اجنبی نوجوان کو کھڑے پایا۔ ندوی صاحب نے سلام کیا اور پوچھا آپ کون؟ میں ضیاء الرحمٰن! نوجوان نے جواب دیا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں، ندوی صاحب بولے۔ نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ امام الدین! نہیں پہچانا۔ مولانا ابوالبقاء صاحب ضیاء الرحمٰن صاحب کو پہلے سے جانتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ امام الدین تھے اب ضیاء الرحمٰن۔ دوسرے ابوالبقاء صاحب کو ان کی آمد کی اطلاع بھی نہیں تھی۔ پھر گزرے پانچ چھ سالوں میں وقت نے ضیاء الرحمٰن صاحب کی شخصیت پر اثر ڈالا تھا۔ حلیہ کچھ اس قدر تبدیل ہو چکا تھا کہ ابوالبقاء صاحب پہلی نظر میں پہچان نہ سکے۔

دن طلوع ہوا تو ضیاء الرحمٰن صاحب نے بلریا گنج جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اکیلے جانے سے کچھ ہچکچا رہے تھے کہ کیسے جائیں گے۔ مولانا ابوالبقاء صاحب نے کہا میں ساتھ چلتا ہوں۔ دونوں حضرات یکّہ سے روانہ ہوئے۔ ادھر بلریا گنج سے حکیم محمد ایوب صاحبؒ نے اپنے معتمد خاص جناب منشی محمد انور صاحب کو ضیاء الرحمٰن صاحب کو لینے شہر اعظم گڑھ بھیجا۔ وہ بھی یکّہ سے اعظم گڑھ آرہے تھے۔ راستے میں دونوں یکّوں کا سامنا ہوا۔ مولانا ابوالبقاء صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب کو منشی محمد انور صاحب کے

حوالے کیا اور خود بلریا گنج سے آنے والے یکے پر بیٹھ کر اعظم گڑھ واپس چلے گئے۔ منشی محمد انور صاحب اور ضیاء الرحمٰن صاحب نے بلریا گنج جانے والے یکے پر بیٹھ کر گھر کی راہ لی۔

سہ پہر کے وقت یہ دونوں حضرات بلریا گنج پہنچے۔ حکیم صاحب کا مکان سڑک کے کنارے مغرب کی سمت ہے۔ ان کے گھر سے پہلے والی گلی میں ضیاء الرحمٰن صاحب کا گھر ہے۔ ضیاء الرحمٰن صاحب سیدھے حکیم صاحب کے گھر پہنچے، اپنے گھر نہیں رکے۔ ان کی آمد کی خبر سے زیادہ لوگ واقف نہیں تھے۔ رات ہوئی تو حکیم صاحب نے ان کے والد کو خاموشی سے پیغام بھیجا کہ آپ کے بیٹے آگئے ہیں۔ رات زیادہ ہو چکی تھی اس لئے طے ہوا کہ صبح ملاقات ہوگی۔ یہ احتیاط اس لئے کی گئی کہ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ اہل خانہ کا ردِّ عمل کیا ہوگا۔ صبح ہوتے ہی پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ امام الدین آئے ہیں۔ ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ ضیاء الرحمٰن صاحب کے والدین اور دیگر اہل خانہ بھی حکیم صاحب کی اس بیٹھک میں جمع ہوئے جہاں ضیاء الرحمٰن صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ حکیم صاحب کی تاریخی بیٹھک تھی جہاں تحریک اسلامی کے قائدین بھی آکر ٹھہرتے تھے اور جہاں سے تحریک کا دعوتی کام بھی ہوتا تھا۔ اسی بیٹھک میں چند سال قبل ضیاء الرحمٰن صاحب نے بلریا گنج میں پہلی مرتبہ باجماعت نماز ادا کی تھی۔ یہ عشاء کی نماز تھی جس کی امامت جناب ابوالبقاء ندوی صاحب نے کی تھی اور مصلّین میں ضیاء الرحمٰن صاحب کے ساتھ حکیم محمد ایوب صاحب، حاجی امانت اللہ صاحب اور ماسٹر جنید احمد صاحب (اللہ ان کے درجات بلند کرے) تھے۔ ابھی نماز مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ ضیاء الرحمٰن صاحب کے اہل خانہ اور دیگر شر پسند عناصر ان کو ڈھونڈتے ہوئے پہنچ گئے تھے اور زور زور سے پکارنے لگے تھے، بانکے بانکے۔ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ گھر سے نکل کر ادھر آئے ہیں۔ کافی ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ان کی ابتلاء اور آزمائش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اللہ کی شان کی وہی بیٹھک تھی اور وہی لوگ۔ منظر نامہ بدل چکا تھا۔ سالوں سے ضیاء الرحمٰن صاحب کی ماں کا حکیم صاحب سے شکوہ تھا کہ تم نے میرے بیٹے کو مجھ سے جدا کر دیا ہے۔ حکیم صاحب نے ان کی ماں سے کہا ''لیجئے اپنے بیٹے کو''۔ ماں نے ایک نظر بیٹے پر ڈالی۔ گزرے سالوں میں چہرے پر کافی تبدیلی آچکی تھی۔ یا تو پہچان نہ سکیں

یا جذبات غالب تھے بولیں ''حکیم جی یہ ہمرے لعل ناہیں''۔ حکیم صاحب نے کہا ٹھیک سے دیکھیں یہی آپ کے لعل ہیں۔ والد کچھ نہیں بولے صرف کھڑے روتے رہے۔ آنسو تھے کہ تھم نہیں رہے تھے۔ پتہ نہیں ندامت کے آنسو تھے یا خوشی کے۔ یا شاید دونوں کے۔ ماں نے بیٹے کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ضیاء الرحمٰن صاحب کے کان میں سوراخ تھا جو اس زمانے کا عام ہندو رواج تھا۔ اس پر ہاتھ پڑا۔ کسی زخم کا بھی نشان تھا۔ اسے دیکھا۔ زور سے چیخیں ''ہمرے لعل'' برسوں کے گلے شکوے آنسوؤں میں بہہ گئے۔ پانچ سال بعد ماں بیٹے کا ملن پورا مجمع دیکھ رہا تھا۔ ماں، باپ اور بیٹے سب رو رہے تھے۔ اور ساتھ ہی پورا مجمع بھی۔ چشم فلک نے ایسے مناظر کم ہی دیکھے ہوں گے۔

اب نہ کوئی شکایت تھی اور نہ غصہ۔ اہل خانہ نے حقیقت تسلیم کر لی تھی۔ ضیاء الرحمٰن صاحب بھی پرسکون ہو گئے۔ جلد ہی رمضان کے روزے شروع ہو گئے۔ اہل محلّہ نے کہا کہ تراویح کی نماز آپ پڑھائیں۔ ضیاء الرحمٰن صاحب نے محلے کی مسجد میں پورے رمضان تراویح کی نماز پڑھائی۔ ان کے گھر کے لوگ مسجد کے باہر بیٹھ کر سنتے تھے۔ عید قریب آئی تو گاؤں والوں نے اعلان کر دیا کہ اس مرتبہ عید کی نماز ضیاء الرحمٰن صاحب پڑھائیں گے۔ اس پورے واقعے کو خود ان کی زبانی سنتے ہیں۔

''لگ بھگ پانچ سال گزارنے کے بعد میں نے کچھ عرصے اپنے آبائی قصبے میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں میں نے اپنے اسی محسن کے یہاں قیام کیا جنھوں نے مجھے سب سے پہلے سید مودودیؒ کی ایک چھوٹی سی کتاب ''دین حق'' کے ذریعہ اسلام سے روشناس کرایا تھا۔ لوگوں کو جب میرے آنے کی خبر ملی تو جوق در جوق مجھ سے ملنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ان میں ہندو بھی تھے۔ اس کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ انھوں نے جب دیکھا کہ اس قدر مصائب اور شدائد کے باوجود میں نے اسلام پر استقامت دکھائی ہے اور مجھے کوئی لالچ اور خوف راہ حق سے منحرف نہیں کر سکا۔ تو ان کی نفرت عقیدت میں بدل گئی۔ اس دوران عید الفطر آ گئی۔ مسلمانوں نے اعلان کر دیا کہ عید کی نماز بھی میں ہی پڑھاؤں گا اور خطبہ بھی میں ہی دوں گا۔ اس اعلان کے نتیجے میں نہ صرف قرب و جوار کے ہزاروں مسلمان

عیدگاہ میں جمع ہوگئے بلکہ عیدگاہ کے باہر ہزاروں ہندو بھی میری تقریر سننے کے لئے پہنچ گئے۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ مسلمانوں نے ایک ایسے شخص کو جو چند برس پہلے ہندو تھا اپنی مذہبی پیشوائی اور امامت کے منصب پر کس طرح فائز کرلیا۔ وہ اسلام کے اس پہلو اور میری تقریر سے حد درجہ متاثر ہوئے''۔
(اردو ڈائجسٹ ۱۹۷۸ء)

والدین سے ملاقات اور عید کا خطبہ اس داستان کا نکتۂ عروج ہے۔ اس خطبے کے بعد ضیاء الرحمٰن صاحب پورے بلریا گنج کے فرزند تھے اور پورے علاقے کے چہیتے۔ چند سال پہلے اٹھنے والے نفرت اور غصے کے بادل محبت اور الفت کے جذبات میں ڈھل گئے تھے۔ ان کے قبول اسلام اور اس کے بعد کے حالات کو جس دانش مندی اور حکمت سے بلریا گنج کی مسلمان آبادی نے حل کیا وہ اس آیت قرآنی کی عملی مثال ہے:

[وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ فَإِذَاالَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ]

رمضان کی تعطیل کے بعد ضیاء الرحمٰن صاحب عمرآباد واپس چلے گئے اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جامعۃ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ سے ایم اے (ماجستر) کیا۔ اس کے بعد وہ رابطہ عالم اسلامی سے منسلک ہوگئے۔ رابطہ میں رہتے ہوئے انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور جامعہ ازھر مصر سے اعزاز کے ساتھ پی ایچ ڈی (دکتوراہ) کی ڈگری حاصل کی۔

بلریا گنج کے اسکول میں ہندی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والا لڑکا دنیا کی قدیم ترین اور موقر ترین درسگاہ سے دینی علوم کی اعلیٰ ڈگری عربی زبان میں تحقیقی مقالہ لکھ کر حاصل کرتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسی دوسری مثال شاید ہی مل سکے۔

[ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَن يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔]

پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد ضیاء الرحمٰن صاحب نے جواب دکتور یعنی ڈاکٹر ہو چکے تھے رابطہ عالم اسلامی چھوڑ کر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کی جاب قبول کرلی۔ یہاں مراعات کم تھیں لیکن علمی ماحول تھا جس کی انھیں تلاش تھی۔ اس سے قبل ان کو سعودی عرب کی شہریت بھی مل گئی تھی۔ سعودی عرب میں بعض تکنیکی وجوہات سے ان کے نام میں پھر تبدیلی کرنی پڑی اور وہاں کی دستاویزات میں ان کا نام آیا۔ محمد عبداللہ۔ بعد میں اپنے بڑے فرزند کی نسبت سے کنیت اختیار کی ''ابواحمد''۔ ان کی تصانیف پر ان کا نام کچھ اس طرح آتا ہے۔ ''ابواحمد محمد عبداللہ الاعظمی المعروف بضیاء الرحمٰن الاعظمی''

ضیاء الرحمٰن سے محمد عبداللہ کا سفر ترقی کی منزلوں کا سفر ہے۔ یہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے ایک برگزیدہ بندے کے لئے دین حق کی تلاش میں اٹھائی گئی مشقتوں اور آزمائشوں کے انعام کا مرحلہ ہے۔

جامعہ اسلامیہ میں ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ پروفیسر، صدر شعبہ اور ڈین کلیۃ الحدیث کے عہدے تک پہنچے اور اسی عہدے سے دو ہزار پانچ میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے ایک پروجیکٹ پر کام کرنا شروع کیا جس کا خواب عرصے سے دیکھ رہے تھے وہ تھا تمام صحیح مرفوع احادیث کو ایک جگہ اکٹھا کرنا۔ بارہ سال کی شب و روز ریاضت کے بعد ان کی یہ کاوش الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل کے نام سے پہلے بارہ پھر انیس جلدوں میں شائع ہوئی۔ جس میں سولہ ہزار سے زائد مستند احادیث شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی درجنوں دیگر تصانیف میں ہندی زبان میں قرآن کریم کا انسائیکلو پیڈیا بھی شامل ہے۔ ہندی ہی میں لکھی گئی ان کی کتاب ''قرآن کی شیتل چھایا'' (قرآن کی ٹھنڈی چھاؤں) بہت مقبول ہوئی جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ حدیث نبوی ﷺ سے محبت ان کے رگ و پے میں رچی بسی تھی۔ ہفتے میں دو روز مسجد نبوی میں بعد نماز عشاء درس حدیث دیتے تھے جس کا سلسلہ آخر تک چلتا رہا۔ تیس جولائی دو ہزار بیس کو عرفہ کے دن عین اس وقت جب مؤذن نے ظہر کی اذان کی صدا بلند کی

حدیث نبوی ﷺ کے اس شیدائی نے جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ مسجد نبوی جس کے سائے میں برسوں سے تشنگان علم کو احادیث نبویہ کا درس دیتے تھے، میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں جنت البقیع میں سپرد خاک کردیا گیا۔

[اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیْہِ رَاجِعُوْن]

یہاں پہنچ کر دین حق کے اس شیدائی کی داستان عزیمت تکمیل کو پہنچتی ہے۔ لیکن ان کی تابندہ زندگی کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جو ہنوز تفصیل طلب ہیں۔ آیئے ہم ان کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

سفر ہدایت کی منزلیں:

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے سفر ہدایت کو ہم چار منزلوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ مطالعۂ اسلام

۲۔ قبول اسلام

۳۔ انکشاف قبول اسلام

۴۔ اعلان قبول اسلام

دستیاب معلومات کے مطابق مطالعہ اسلام کی منزل اس وقت شروع ہوتی ہے جب ان کو ۱۹۵۹ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد تعطیلات میں بلریا گنج آمد کے دوران مولانا مودودیؒ کی کتاب ''دین حق'' کے ہندی ترجمہ کے مطالعہ کا موقعہ ملتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد ان کی دلچسپی اسلام میں بڑھنے لگتی ہے۔ اور ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی آنے لگتی ہے۔ چھٹیوں کے بعد کالج واپس آنے کے بعد وہ مولانا مودودیؒ کی ہندی میں ترجمہ شدہ دیگر دستیاب کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی دوران انھیں خواجہ حسن نظامی کا ہندی ترجمہ قرآن پڑھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اسلامی کتب اور قرآن کریم کے مطالعہ کے بعد ذہن میں پیدا ہونے والے اشکالات اور سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لئے وہ شبلی کالج کے

ایک استاد جناب سلطان مبین صاحبؒ سے رجوع کرنے لگتے ہیں۔اسی اثناء میں وہ کالج ہی کے ایک اور استاد جناب ماسٹر عبدالحکیم صاحبؒ کے حلقۂ درس قرآن میں شرکت بھی کرتے ہیں۔ یہ منزل اسلام کی دریافت اور جستجوئے راہ حق کی منزل ہے۔

سفر ہدایت کی اگلی منزل قبول اسلام کی منزل ہے۔ جب وہ ماسٹر عبدالحکیم صاحبؒ کے ہاتھوں اسلام قبول کرتے ہیں۔ دین حق کا متلاشی راہ دکھانے والے سے کہتا ہے کہ مجھے سچائی کا راستہ مل گیا ہے مجھے قافلہ اہل حق میں شامل کر لیجئے۔ ماسٹر صاحب انھیں کلمۂ شہادت پڑھاتے ہیں اور ان کی اقتداء میں جدید الاسلام زندگی کی پہلی نماز ادا کرتا ہے۔قبول اسلام کے بعد کمسن نوجوان اس اضطراب سے دوچار ہے کہ اس انقلابی عمل کے بعد اپنے اہل خانہ سے اس کا نباہ کیسے ہوگا؟ اس کے عمل کا بہنوں کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا؟ خاندان والے اسے کیسے قبول کریں گے؟ یہی وجہ ہے کہ ایک مدت تک وہ قبول اسلام کا اعلان نہیں کرتے۔ یہ دوران کی ذہنی کشمکش اور داخلی اضطراب کا دور ہے۔

سفر ہدایت کی اگلی منزل انکشاف قبول اسلام کی منزل ہے، جب اعظم گڑھ میں ان کے قریبی عزیز ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔اور ان کے والد کو صورت حال سے مطلع کرتے ہیں۔اطلاع پا کر ان کے والد فوراً کلکتہ سے واپس آتے ہیں اور انھیں اپنے ساتھ لے کر کلکتہ چلے جاتے ہیں تا کہ ماحول کے بدلنے سے ذہن تبدیل ہو جائے۔لیکن ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔کلکتہ سے کچھ مدت کے لئے انھیں الہٰ آباد بھیجا جاتا ہے تا کہ جھاڑ پھونک اور ٹونا ٹوٹکا کر کے ان کا ذہنی علاج کیا جا سکے۔اسی دوران ان کا پنڈتوں اور پروہتوں سے اسلامی تعلیمات اور ہندو مذہب پر مناظرے کا سلسلہ بھی ہوتا ہے۔ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد وہ واپس بلریا گنج آجاتے ہیں اور اپنے گھر ہی میں اپنے والدین اور بہنوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں بھی جھاڑ پھونک اور پنڈتوں سے مناظرے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ دور بیرونی دباؤ اور خارجی کشمکش کا دور ہے۔ابھی انھوں نے قبول اسلام کا اعلان نہیں کیا ہے لیکن گاؤں کے باہر کھیتوں اور باغات میں چھپ چھپ کر نماز پڑھتے دیکھ کر اہل قریہ تبدیلی محسوس کر لیتے ہیں

جس کی اطلاع اہل خانہ تک پہنچ جاتی ہے۔اب اسلام کی حقانیت اور اہل خانہ کی محبت کے درمیان کسی ایک کے انتخاب کرنے کی مشکل گھڑی آ پہنچی ہے اور یہ اس سفر کی سب سے دشوار منزل ہے۔

سفر ہدایت کی آخری منزل اعلان قبول اسلام کی منزل ہے جب دین حق کا متلاشی اپنے فیصلے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ مرحلہ اس وقت آتا ہے جب بلریا گنج میں وہ پہلی مرتبہ باجماعت نماز ادا کرتے ہیں اور اہل خانہ اور اہل شہر کو معلوم ہو جاتا ہے۔ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور سب کو تبدیلی کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس واقعے کے بعد وہ اپنے قبول اسلام کا باقاعدہ اعلان کر دیتے ہیں۔

اعلان قبول اسلام کے بعد آزمائش کے چار مراحل آتے ہیں۔

۱۔ بلریا گنج میں ابتلاء و آزمائش کا سلسلہ

۲۔ آریہ سماج کے لوگوں کو حوالہ کرنے کا مرحلہ اور روپوشی

۳۔ رامپور اور ٹکرالہ کی اسلامی درسگاہوں میں قیام

۴۔ جامعہ دارالسلام عمر آباد میں تعلیم اور قیام

اعلان قبول اسلام کے بعد ان کی ابتلاء اور آزمائش کا دور شروع ہو جاتا ہے۔اہل خانہ کو خدشہ ہے کہ اب ان کی واپسی ممکن نہیں۔ اس سے پہلے ان کو امید تھی کی شاید وہ ان کا ذہن بدلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ابتلاء اور آزمائش ذہنی اور جذباتی بھی ہے اور جسمانی بھی۔والدہ، والد اور بہنوں کی جانب سے ذہنی و جذباتی دباؤ ہے۔ جسمانی ایذاء رسانیاں زیادہ تر ان کے ایک چچا کے ہاتھوں ہوتی ہیں۔ ابتلاء و آزمائش کے اس مرحلے کے دوران وہ گھر پر اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ ہر طرح کی سختیوں کا سامنا کرتے ہیں۔اس دوران ان کے اہل خانہ کے ساتھ تعلقات کافی کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ دور جسمانی اور ذہنی ابتلاء کا دور ہے۔

جسمانی سختیوں اور ذہنی اور جذباتی دباؤ کے باوجود جب وہ اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹتے تو ان کے اہل خانہ انھیں آریہ سماج والوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔لیکن وہ معجزانہ طور پر ان کے چنگل

سے بچ نکلتے ہیں اور شہر اعظم گڑھ میں اپنے بعض خیر خواہوں کے تعاون سے کہیں روپوش ہوجاتے ہیں۔ کچھ مدت روپوش رہنے کے بعد وہ جناب عبدالعزیز خان صاحبؒ کے مشہور موتی کارخانے پہنچتے ہیں جہاں اس وقت جماعت اسلامی کا مکتبہ ہے۔ اسلام پر ہندی میں کتابیں لینے کے لئے ان کا وہاں پہلے سے آنا جانا ہے۔ مقامی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے بہی خواہ ان کو اعظم گڑھ سے باہر کسی ایسی جگہ بھیجنے کا فیصلہ کرتے ہیں جہاں وہ اہل خانہ اور آریہ سماج والوں کی پہنچ سے دور ہوں۔ پہلے درسگاہ اسلامی رامپور اور پھر ککرالہ کی اسلامی درسگاہ کچھ عرصے کے لئے ان کا مسکن بنتی ہیں۔ جہاں وہ دینی علوم اور اردو زبان سیکھتے ہیں۔ ککرالہ میں تحریک اسلامی سے وابستہ جو افراد ان کا تعاون کرتے ہیں ان میں جناب عبیدالرحمٰن خان عرف بنے خان اور جناب حافظ عبدالقیوم صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ اطلاع ملنے پر کہ ان کے اہل خانہ ان کے مسکن کا پتہ جان چکے ہیں ان کو ککرالہ چھوڑ کر دوبارہ نیا ٹھکانہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ بالآخر اعظم گڑھ سے ہزاروں میل دور جنوبی ہند کی مشہور درسگاہ دارالسلام عمرآباد ان کے لئے حفظ وامان کا دامن وا کرتی ہے۔ یہاں وہ لگ بھگ چھ سال سکون سے قیام کرتے ہیں۔ عربی زبان سیکھتے ہیں۔ دینی علوم میں دسترس حاصل کرتے ہیں۔ وہاں کے مشفق اساتذہ خصوصاً مولانا حفیظ الرحمٰن اعظمی عمری مدنی حفظہ اللہ، مولانا ظہیرالدین رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ، مولانا خلیل الرحمٰن عمری رحمۃ اللہ ان کا بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ دیگر اساتذہ میں مولانا حافظ سید عبدالکبیر صاحب عمری اور مولانا ابوالبیان حماد صاحب عمری رحمۃ اللہ علیہم بھی شامل ہیں جو مشغولیت کی وجہ سے اضافی وقت نہیں دے پاتے۔ ان سے رات کے آخری پہر استفادے کا موقعہ ملتا ہے۔ بالآخر شدید محنت اور لگن کے نتیجے میں عربی درجات کا آٹھ سال کا کورس چھ سال میں مکمل کرکے امتیازی نمبرات سے فضیلت کی سند حاصل کرتے ہیں۔

اس طرح اگر دیکھا جائے تو قبول اسلام کے بعد لگ بھگ چھ مہینے ابتلاء وآزمائش، ڈیڑھ سال قیام رامپور اور ککرالہ اور چھ سال قیام عمرآباد کا دورانیہ بنتا ہے۔ اس میں ابتلاء وآزمائش کا دور چند مہینوں پر محیط ہے۔ جس میں جسمانی ایذاء رسانی کم اور ذہنی اور جذباتی تشدد کے لمحات زیادہ ہیں۔ ابتلاء وآزمائش

بلریا گنج میں ہوتی ہے۔شہر اعظم گڑھ میں روپوشی ہے۔رامپور اور کگرالہ کی درسگاہوں میں اہل خانہ کے پہنچنے کا خدشہ ہے۔جب کہ عمر آباد میں اطمئنان،سکون اور یکسوئی ہے۔

عمر آباد سے ان کی وطن واپسی لگ بھگ پانچ سال کے بعد ہوتی ہے۔جس کے بعد اپنے اہل خانہ سے ان کے تعلقات معمول پر آجاتے ہیں۔جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔پوری کوشش کرتے ہیں کہ والدین دائرہ اسلام میں داخل ہوجائیں لیکن ہدایت کی راہ ان پر نہیں کھلتی۔کہتے ہیں۔

''میں نے انھیں (والدین) اسلام کی دعوت پیش کی تو انھوں نے کہا کہ ہم اسلام کو دل کی گہرائیوں سے پسند کرتے ہیں۔لیکن سردست ہم اپنے اندر قبول اسلام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔میں نے بھی زیادہ اصرار کرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے حق میں اللہ سے دعا کرتا رہوں اور اس دن کا انتظار کروں جب اللہ کے فضل سے ان کے دل میں اسلام کے لئے شیفتگی خود بخود تڑپ میں تبدیل ہوجائے۔اور وہ کسی خارجی دباؤ کے بجائے خود اپنے داخلی دباؤ سے حلقہ بگوش اسلام ہوجائیں''۔(اردو ڈائجسٹ ۱۹۷۸ء)

افسوس کہ وہ دن کبھی نہیں آتا اور نوے کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں ماں باپ دونوں آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔

اہل خانہ سے تعلقات:

ڈاکٹر ضیاالرحمٰن صاحب ؒ پانچ بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔(چار سگی اور ایک ماں کی طرف سے سوتیلی) اس وقت دو بہنیں بقید حیات ہیں۔ان کی پرورش بہت لاڈ و پیار سے ہوئی تھی۔گاؤں میں مشہور تھا کہ ایک حلوائی کے یہاں ان کے والد کا حساب چلتا تھا اور یہ کسی بھی وقت جا کر وہاں سے مٹھائی کھا سکتے تھے ان کے والد جب کلکتہ سے آتے تو حساب بے باق کرتے۔اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے ماں کے بہت لاڈلے تھے۔کھانے کے شوقین تھے۔ان کے لئے ہمیشہ خاص پکوان بنتا تھا۔

ابتلاء اور آزمائش کے چند مہینے چھوڑ دیں تو ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کے تعلقات اپنے اہل خانہ

سے ہمیشہ نہایت خوشگوار رہے۔ انہوں نے اپنے والدین، بہنوں اور ان کی اولاد کا ساری عمر خیال رکھا۔ بیرون ملک جانے کے بعد جب ان کو آسودگی نصیب ہوئی تو انھوں نے اپنے والد صاحب کو کام سے آزاد کر دیا اور ان کی تمام ذمہ داریاں خود سنبھال لیں۔ شروعات میں تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے وہ سعودی عرب سے دس سال تک گھر نہیں آسکے تھے۔ لیکن ۱۹۷۸ء کے بعد دس بارہ سال تک پابندی سے ہر سال تعطیلات میں گھر آتے رہے۔ ان کا قیام ہمیشہ محترم حکیم محمد ایوب صاحبؒ کی رہائش گاہ پر رہا، جنھیں وہ اپنا سرپرست سمجھتے تھے۔ ایرپورٹ سے بلریا گنج آتے ہوئے اپنے گھر کی گلی میں گاڑی سے اتر جاتے اور والدین سے ملاقات کرنے کے بعد حکیم صاحب کے گھر آتے۔ واپسی کے وقت سب سے آخر میں والدین سے مل کر گاڑی میں بیٹھتے۔ دن میں دو مرتبہ (صبح، شام) والدہ سے ملنے جاتے اور گھنٹوں ساتھ رہتے۔ ان کی آمد کے موقعہ پر سب بہنیں، ان کی اولاد اور دیگر رشتہ دار اکٹھا ہوتے۔ مشرقی اتر پردیش کی عام روایت کے مطابق سب کے لئے کپڑے وغیرہ کی خریداری کی جاتی۔ ہفتہ بھر جب تک ان کا قیام رہتا ان کے گھر پر خوب رونق رہتی۔ اس دوران وہ اپنے خاندان کے لوگوں کی، خاص طور پر ضرورت مند رشتہ داروں اور پرانے دوستوں کی خاموشی سے حسب ضرورت امداد کرتے۔

وہ چچا جو ایذاء رسانی میں پیش پیش رہتے تھے ان کا رویہ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ حکیم صاحب کے مکان پر وہی چچا جو اب سادھو بن گئے تھے ان سے ملنے آئے۔ سادھوؤں والا حلیہ۔ کہنے لگے جلدی میں ہوں فلاں جگہ تھا معلوم ہوا کہ آپ آئے ہیں۔ ملنے آ گیا۔ ابھی کہیں اور جانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب نے تالیف قلب کی روایت ادا کی۔ کچھ ناشتے کا سامان رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے کہا، لیجئے۔ چچا نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''بسم اللہ کیجئے''..... یامقلب القلوب

آخری عمر میں والدین نے اپنی بہو، پوتوں اور پوتی کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کی خواہش کی تکمیل کی اور اپنی اہلیہ، بیٹوں اور بیٹی کے ساتھ وطن کا سفر کیا۔ والدین اور بہنوں نے اپنے بہت سارے ارمان پورے کئے۔ جب تک والدین باحیات رہے ڈاکٹر صاحبؒ ان

سے ملنے کے لئے سال کے سال آتے رہے۔ والدین کے سامنے وہ ہمیشہ ایک عام سے انسان نظر آتے۔ وقت رخصت والدہ کے گلے لگ کر دیر تک آنسو بہاتے اور والد کے کندھے کو جذبات میں تھپتھپاتے ڈاکٹر صاحبؒ بہت عظیم نظر آتے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد صرف ایک مرتبہ وطن آئے۔ پچھلے پچیس سالوں میں انھوں نے وطن کا سفر نہیں کیا تھا۔

والدین کے انتقال کے بعد گھر اور دیگر جائداد بہنوں کے حصے میں آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ بھی تقاضا نہیں کیا۔ ان کی یہ خواہش ضرور رہی کہ بہنوں کو مناسب قیمت ادا کر کے پشتینی مکان کی زمین کو لائبریری یا کسی دینی مرکز کے لئے وقف کر دیں۔ لیکن بوجوہ یہ ممکن نہ ہوسکا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد بہنوں کو موقعہ بموقعہ مناسب رقمیں بھیجتے رہے۔ سوتیلی بہن کے شوہر نے ابتلاء کے دنوں میں ان کا سب سے زیادہ ساتھ دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس جذبے کا صلہ یہ دیا کہ بہنوئی کے انتقال کے بعد جب تک بہن زندہ رہیں ہر مہینے ان کو ایک مخصوص رقم اخراجات کے لئے بھیجتے رہے۔ تیس جولائی کو جب ڈاکٹر صاحب کی رحلت کی خبر آئی سب بہنیں، دیگر اہل خانہ اور رشتہ دار ایک جگہ اکٹھا ہوئے۔ معلوم نہیں کیا تعلق محسوس کیا کہ سب جمع ہو کر ہمارے والد جناب ڈاکٹر علاؤالدین صاحب (جو نانا حکیم محمد ایوب صاحبؒ کے انتقال کے بعد گھر کے سرپرست ہیں) کے پاس آئے۔ میں نے اتفاق سے اسی وقت گھر فون کیا تھا۔ پتہ چلا کہ گھر میں بھیڑ ہے۔ باہر مرد اور اندر خواتین اکٹھا ہیں۔ بعد میں بات ہوگی۔ میں نے پوچھا کون ہیں۔ جواب ملا ڈاکٹر صاحب کے گھر کے لوگ۔ میں نے فون بند کر دیا اور دیر تک سوچتا رہا کہ انسانی رشتوں اور تعلقات کی نفسیات کتنی پیچیدہ ہوتی ہے۔ اسی وقت واٹس ایپ پر پیغام موصول ہوا۔ کسی نے مسجد نبوی میں ڈاکٹر صاحبؒ کے جنازے کا ویڈیو بھیجا تھا۔ میرے خدا میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ ایک صدا آئی۔

[فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَان]

تحریکِ اسلامی سے تعلقات کی نوعیت:

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کی زندگی پر تحریک اسلامی کے گہرے اثرات رہے۔ ان کا سفر ہدایت مولانا مودودیؒ کی کتاب ''دین حق'' کے ہندی ترجمہ کے مطالعے سے شروع ہوا تھا۔ یہ کتاب ان کو جناب حکیم محمد ایوب صاحبؒ نے دی تھی جو جماعت اسلامی کے سرگرم رکن اور بلریا گنج کے امیر مقامی تھے۔ گاؤں کے دیگر افراد جنھوں نے قدم در قدم ان کا ساتھ دیا تھا تحریک اسلامی سے متعلق تھے۔ شبلی کالج کے استاد ماسٹر عبدالحکیم صاحبؒ جن کے ہاتھوں ڈاکٹر صاحب نے اسلام قبول کیا تھا جماعت کے قدیم رکن تھے۔ آزمائش و ابتلاء کے ایام میں رامپور، ٹکرالہ اور عمرآباد میں ہر جگہ انھیں تحریک اسلامی سے متعلق افراد کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہی۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کے سفر ہدایت کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ تحریک اسلامی کے افراد کی دعوتی کوششوں کے نتیجے میں دائرہ اسلام میں نہیں داخل ہوئے تھے بلکہ مطالعے، تحقیقات اور جستجو کے ذریعے ان پر اسلام کی حقانیت آشکار ہوئی تھی۔ قبول اسلام ان کی اپنی دریافت تھی نہ کہ کسی کی دعوتی کوششوں کا نتیجہ۔ درحقیت دین حق کی تلاش ان کے اپنے دل کی آواز تھی اور اس تلاش میں انھیں جن لوگوں سے تعاون ملا یا آزمائش کی گھڑی میں جن لوگوں نے شفقت کا ہاتھ بڑھایا ان کا تعلق تحریک اسلامی سے تھا۔ اپنے ایک ویڈیو انٹرویو میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ دین حق کی تلاش میری اپنی جستجو تھی اور میں اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لئے مختلف لوگوں سے ملتا تھا اور طرح طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ میرا مقصد اپنے آبائی دین اور اسلام کی تعلیمات کا تقابلی جائزہ لینے کا تھا اور بالآخر میں اسلام کی حقانیت کا قائل ہوکر دائرہ اسلام میں داخل ہوگیا۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب کے قبول اسلام کے واقعے کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

تحریک اسلامی سے وابستہ افراد سے ان کے ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے۔ جماعت اسلامی ہند کے چھٹے کل ہند اجتماع حیدرآباد ۱۹۸۱ء میں وہ اس وفد کا حصہ تھے جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے اجتماع میں شرکت کے لئے آیا تھا۔ دہلی میں قیام کے دوران ان کا اکثر وقت جماعت اسلامی کے چتلی قبر واقع مرکز

میں گزرتا تھاجہاں وہ محترم نسیم احمد غازی صاحب کے مہمان ہوتے۔ پڑوسی ملک میں ان کی کئی تصانیف تحریک اسلامی کے ادارہ معارف اسلامی سے شائع ہوئی ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی تصنیف الجامع الکامل مولانا مودودی کے ادارے ترجمان القرآن سے شائع ہو جو بوجوہ ممکن نہ ہو سکی۔ عمرآباد پہنچنے کے بعد ان کا رجحان اہل حدیث فکر کی طرف ہو گیا تھا۔ ان کا یہ رجحان بھی کسی کی کوششوں کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ فقہی معاملات میں مسلکی تقلید سے ہٹ کر غیر تقلیدی طرز عمل اپنانا ان کے شفاف ذہن کی دریافت تھی کیوں کہ ان کا ذہن پہلے سے کسی مسلکی تعصب کے زیر اثر نہیں تھا۔ تقویۃ الایمان اور بلوغ المرام جیسی کتابوں کے مطالعے کے بعد ان کے اندر نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ ہمیں ان کی فکری سوچ اور مسلکی رجحان کو ان مخصوص حالات کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے جن سے کہ وہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں گزرے تھے۔ چاہے دین حق کی تلاش کا سفر ہو یا فقہی معاملات میں غیر مقلدانہ طرز عمل کا انتخاب یہ ان کی دریافت کا نتیجہ تھا نہ کہ روایتی تقلید کا۔

ایک یادگار سفر کی روداد:

یہاں میں قارئین کو ایک یادگار سفر کی یادوں میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ انیس سو اٹھاسی میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی اہلیہ اور بچوں کے ساتھ وطن کا سفر کیا تھا۔ میں ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش پر میں نے ان کے ساتھ دہلی سے بلریا گنج اور پھر واپسی کا سفر کیا تھا۔ ہم لوگ فلائٹ سے بنارس پہنچے، بلریا گنج سے منشی محمد انور صاحب (قدیم رکن جماعت اور جامعۃ الفلاح کے سابق نائب ناظم) اور ہمارے والد صاحب دو گاڑیوں میں مہمانوں کو لینے آئے تھے۔ جامعہ سلفیہ کے احباب کو بھی ڈاکٹر صاحب کے پروگرام کی اطلاع تھی اور وہاں سے بھی کچھ لوگ استقبال کے لئے آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہم لوگوں کا اکثر جامعہ سلفیہ جانا ہوتا تھا اور وہاں سے بھی بہت سارے احباب ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے بلریا گنج آتے تھے۔ اس لئے جامعہ سلفیہ کے بہت سارے احباب سے واقفیت تھی اور اکثر جماعت اسلامی اور اہل حدیث فکر کو لے کر دلچسپ نوک جھونک بھی چلتی تھی۔

ایرپورٹ پر مجھے ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ باہر نکلتے دیکھ کر جامعہ سلفیہ کے ایک عزیز نے پوچھا یہ ساتھ میں کون ہے؟ منشی محمد انور صاحب برجستہ بولے یہ ہمارا آدمی ہے آپ لوگ یہاں استقبال کے لئے آئے ہیں ہمارا آدمی دہلی سے ساتھ آرہا ہے۔ سب ہنس دیے۔ واپسی کے سفر میں صبح کی فلائٹ تھی۔ ہم لوگ شام میں ہی بنارس پہنچ گئے تھے اور جامعہ سلفیہ کے مہمان خانے میں قیام کیا تھا۔ ڈاکٹر مقتدی حسن ازھریؒ نے اپنے گھر پر شاندار ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ کھانے کے بعد رات دیر گئے تک گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ بات تحریک اسلامی اور اہل حدیث فکر کی طرف جانکلی۔ میں نے از راہ مذاق کہا دیکھئے کتنا قیمتی ہیرا ہم نے آپ کو دیا۔ میرا اشارہ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب کی طرف تھا جو کہ مولانا مودودیؒ کی کتابیں پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ڈاکٹر عبد الرحمٰن الفریوائی بھی مجلس میں موجود تھے۔ برجستہ بولے۔ کیسا دیا تھا ہم جانتے ہیں تراشنے میں بہت محنت کرنی پڑی۔ مجلس پر لطف ہوگئی۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب دور بیٹھے مسکراتے رہے۔ مجھے لگا کہ مختلف مکتبۂ فکر کے لوگوں کو ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ دل میں وسعت پیدا کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب کا کردار اور عمل اس کی واضح مثال ہے۔

جامعۃ الفلاح سے تعلق:

جامعۃ الفلاح بلریاگنج میں قائم عظیم الشان دانشگاہ ہے جو نہ صرف پورے ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں اپنے عصری اور دینی علوم کے حسین امتزاج پر مبنی نصاب تعلیم کی وجہ سے مشہور ہے۔ بلریاگنج میں شمال سے داخل ہوتے ہوئے اس کی حسین وجمیل عمارتیں اور اس کی شاندار مسجد کے بلند و بالا مینار آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتے ہیں۔ یہ دانشگاہ ۱۹۶۲ء میں تحریک اسلامی کے افراد اور مقامی حضرات کی کوششوں سے ایک قدیم مکتب کی بنیادوں پر قائم ہوئی ہے اور ہندوستان اور بیرون ملک میں تحریک اسلامی کی پہچان تصور کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا آبائی مکان یہاں سے لگ بھگ پانچ سو میٹر شمال میں واقع ہے۔ ڈاکٹر صاحب جامعۃ الفلاح کے قیام سے قبل ہی بلریاگنج سے عمر آباد چلے گئے تھے۔ اس لئے ان کا جامعہ سے طالب علمانہ تعلق کبھی نہیں رہا۔ البتہ عمر آباد کے قیام کے دوران جب کبھی وہ بلریاگنج آئے ان کا دن کا زیادہ تر وقت

جامعہ میں گزرتا۔ جہاں وہ جامعہ کی لائبریری میں مطالعے میں مصروف رہتے اور ممتاز عالم دین حضرت مولانا جلیل احسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے علمی استفادہ کرتے۔ سعودی عرب پہنچ کر بھی ان کا رابطہ جامعہ اوراس کے متعلقین سے برابر قائم رہا۔ اپنی مطبوعہ کتابوں کے نسخے وہ جامعۃ الفلاح کی لائبریری کے لئے ضرور بھجواتے۔ بلریا گنج کے اپنے ایک سفر کے دوران ڈاکٹر صاحب نے جامعہ میں فن روایت حدیث پر کئی طویل توسیعی خطبے دیئے تھے۔ لیکن جامعہ میں ان کے لیکچرس بہت زیادہ نہیں ہو سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی آمد اکثر رمضان کے ایام میں ہوتی تھی جب تعطیلات کی وجہ سے جامعہ بند رہتا تھا۔ یا ان کا قیام مختصر ہوتا تھا جس کی وجہ سے کوئی پروگرام نہیں ہو پاتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گھر آمد کے موقع پر وہ زیادہ وقت اپنے والدین کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے اور کسی اور مصروفیت سے بچنے کی کوشش کرتے۔ جامعہ کے اساتذہ سے ہمیشہ ان کا احترام کا تعلق رہا۔ جامعہ کے نمائندے جب سعودی عرب کا سفر کرتے تو ڈاکٹر صاحب حسب استطاعت اپنا تعاون پیش کرتے۔ جامعہ اسلامیہ میں زیر تعلیم جامعہ کے طلبہ ان سے برابر رابطے میں رہتے۔ جامعۃ الفلاح کے سابق ناظم استاذ محترم جناب محمد طاہر عمری مدنی صاحب جامعہ اسلامیہ میں اپنی طالب علمی کے دوران ان سے بے حد قریب رہے۔ جامعۃ الفلاح کے موجودہ ناظم استاذ محترم مولانا رحمۃ اللہ اثری فلاحی صاحب نے اپنا ماجستر کا مقالہ ڈاکٹر صاحب کے ہی زیر اشراف تیار کیا تھا۔

جامعۃ الفلاح کے تعلق سے ڈاکٹر ضیاالرحمٰن صاحب کا ایک اہم کردار اس وقت سامنے آیا۔ جب وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر دکتور عبداللہ بن محمد الزاید کی زیر قیادت ایک وفد کے ہمراہ یہاں آئے تھے۔ اس موقعے پر انھوں نے ایک طرح سے وفد کی نہیں بلکہ جامعہ کی نمائندگی کی تھی۔ یہ وفد جماعت اسلامی ہند کے چھٹے کل ہند اجتماع حیدرآباد ۱۹۸۱ء میں شرکت کے بعد آیا تھا۔ جامعۃ الفلاح کی تاریخ کا یہ ایک یادگار لمحہ تھا۔ اس موقعے پر عرب مہمانوں کی تقاریر کی اردو ترجمانی ڈاکٹر صاحب نے کی تھی۔ ترجمانی کرتے ہوئے ابتداء میں کہا گیا ان کا یہ جملہ ''حمد وثناء کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا''

بڑا مقبول ہوا تھا۔ دور دور سے لوگ پروگرام میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی آمد کی اطلاع سن کر غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں آئے تھے اور مسجد کے سامنے مشرق کی سمت سڑک پر کھڑے تھے۔ مہمانوں کی رہائش کا انتظام حکیم محمد ایوب صاحبؒ کے مطب کی اوپر کی منزل پر کیا گیا تھا۔ صبح کے وقت ڈاکٹر صاحب نے اوپر کی منزل سے باہر کی طرف دیکھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ مطب کے پیچھے کسی کے کھلیان میں بیلوں کی جوڑی سے چل رہی مشین سے گنے کا رس نکالا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو بچپن کی یاد آ گئی۔ خواہش ظاہر کی کہ مہمانوں کو ناشتے میں مقامی سوغات پیش کی جائے۔ محترم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب (سابق ناظم جامعۃ الفلاح اور قدیم رکن جماعت) پاس کھڑے تھے۔ وقت کم تھا۔ کسی سے کہنے کے بجائے خود بھاگے بھاگے گئے اور ادرک لگا کر تازہ تازہ گنے کا رس نکلوا کر لے آئے۔ تمام مہمانوں نے شوق سے پیا۔ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب جامعہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور جامعہ کی خدمت کے لئے ہمہ وقت تیار۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب کے ان سے بہت خاص تعلقات تھے۔

رات میں حکیم صاحب کے گھر پر کھانا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر رساول بھی تھی۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب نے ڈش وائس چانسلر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''یوکل مع الحلیب'' اور پھر دودھ کا برتن آگے کر دیا۔ میں حیرت میں پڑ گیا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم نے تو پڑھا تھا کہ دودھ کو عربی میں لبن کہتے ہیں۔ بہت بعد میں عرب ملک میں آنے کے بعد پتہ چلا کہ عربی میں دودھ کو حلیب کہتے ہیں۔ جسے عربی میں لبن کہتے ہیں وہ ہم لوگوں کے یہاں مٹھا کہا جاتا ہے۔ اس وفد کی آمد کا پروگرام اچانک طے ہوا تھا۔ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحیؒ اس وقت جامعہ کے صدر مدرس تھے۔ وہ حیدرآباد اجتماع گاہ میں تھے جب ان کو اطلاع ملی کہ مدینہ یونیورسٹی کا وفد جامعہ جا رہا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ ہمیں پہلے پہنچنا چاہیے تا کہ پروگرام وغیرہ کی تیاری کر سکیں۔ ریزرویشن اگلے دن کا تھا۔ چند سینئر اور ذمہ دار طلبہ کو لے کر ایک دن پہلے چل دیئے۔ بغیر ریزرویشن کے جنرل کلاس میں سفر کیا۔ کئی دن کے جگے تھکے ہوئے پہنچے تھے۔ اس موقعہ پر مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے ہاتھوں جامعہ کے ایک ہاسٹل کا سنگ بنیاد بھی رکھا گیا تھا۔

ایک مشفق سر پرست:

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کی زندگی میں ایک نہایت اہم کردار ہمارے نانا جناب حکیم محمد ایوب صاحبؒ کا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۹ء میں ہوئی تھی اوراسی ملاقات میں نانا نے ان کو ''دین حق'' کا ہندی ترجمہ پڑھنے کے لئے دیا تھا۔اس پہلی ملاقات کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے ''مقدمہ تذکرہ حکیم محمد ایوبؒ''میں اس طرح کیا ہے۔

''یوں تو ان کو پہلے بھی دیکھا تھا لیکن آج دیکھنے میں کچھ اور ہی لگ رہے تھے۔صورت اور سیرت دونوں میں یکتائے روزگار، چہرے پرنور کی بارش اور دل میں شفقت وکرم کا جوش''

اس پہلی ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ کا نانا مرحوم اوران کے اہل خانہ سے جو دیرینہ تعلق قائم ہوا وہ آخری عمر تک باقی رہا۔''مقدمہ''میں انھوں نے اس تعلق کی نوعیت کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

''نصف صدی پلک جھپکتے گزر گئی۔اول روز سے جو رابطہ قائم ہوا وہ آج تک باقی ہے۔حکیم صاحب تو نہ رہے لیکن ان کی اولاد کے ساتھ قائم ہے۔ان کی باتیں،ان کی بےلوث محبتیں۔ان کی عنایتیں سب یاد آتی ہیں۔گزرے ہوئے واقعات کا ذکر کروں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں شروع کروں کہاں ختم کروں۔کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ ان یادوں کو سمیٹنے کے لئے مجھے بھی کسی تصنیف کا سہارا لینا پڑے گا۔پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ ایسی گوناگوں شخصیت کا حق میرا کوتاہ قلم ادا نہیں کر سکے گا''۔

ڈاکٹر صاحب اور نانا مرحوم کے اہل خانہ کے درمیان تعلقات نہایت ہی ذاتی نوعیت کے رہے ہیں اور ان کی تفصیلات کو تحریر کرنا مشکل ہے۔''مقدمہ''میں ڈاکٹر صاحب نے کچھ باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ کہہ کر رک گئے ہیں کہ ان کی یادوں کی فہرست بہت طویل ہے۔یہ چند اوراق شاید اس کے عشر عشیر کو بھی نہ سمیٹ سکیں۔ڈاکٹر صاحبؒ کے دل میں نانا مرحوم کا کیا مقام تھا اس کا اندازہ اس تعزیتی خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے نانا مرحوم کے انتقال کے بعد ہمارے بڑے ماموں جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب کے نام ارسال کیا تھا۔

''آپ کے عظیم والد صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے اس غم میں میں آپ کا شریک نہیں بلکہ آپ بھی میرے غم میں شریک ہیں۔ کیوں کہ وہ ہمارے بھی والد اور سرپرست تھے۔ ان کے سایہ عاطفت سے ہم سب محروم ہو گئے''۔

نانا مرحوم احادیث نبویہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بہت حساس تھے اور اس سلسلے میں بہت سخت جذبات رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی بھی پوری زندگی احادیث رسول اللہ ﷺ کی تدریس وتحقیق میں گزری تھی اور وہ اسی حوالے سے جانے جاتے تھے۔ نانا مرحوم کے حب سنت رسول اللہ ﷺ کے جذبے کو ڈاکٹر صاحب نے ''مقدمہ'' میں اس طرح سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''یہ حسن اتفاق ہے کہ ابھی حال میں اپنی کتاب ''الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے اور جس میں تمام صحیح مرفوع حدیثوں کو تخریج وتحقیق کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے لکھ کر فارغ ہوا ہوں اور یہ طبع ہو کر بھی آ گئی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آج محترم ومکرم حکیم صاحب مرحوم زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ کیوں کہ وہ سنت رسول اللہ ﷺ کے شیدائی اور ناموس صحابہ کے محافظ تھے''

میں محسوس کرتا ہوں کہ آج جب ڈاکٹر صاحب کی رحلت کے بعد بلریا گنج کا نام دنیا بھر میں حدیث نبوی ﷺ کے شیدائی کے وطن کے طور پر جانا جا رہا ہے۔ نانا مرحوم کی روح کو کتنا سکون محسوس ہو رہا ہوگا۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب ہماری نانی مرحومہ کا بھی بے حد احترام کرتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں نانی مرحومہ اور نانا مرحوم حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے دوران حج جس طرح ان دونوں کی خدمت کی تھی اس کا ذکر نانی مرحومہ مدتوں کرتی رہیں۔ نانی مرحومہ بھی ڈاکٹر صاحبؒ کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی آمد کے موقعہ پر اہتمام کرتیں کہ ان کی پسند کی چیزیں تیار کی جائیں۔ لال مرچوں کا اچار ڈاکٹر صاحب کو بہت پسند تھا۔ جاڑوں میں ان کے لئے الگ سے اچار تیار کیا جاتا تھا تاکہ واپسی کے سفر میں وہ اپنے ساتھ لے جاسکیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ تذکرہ حکیم محمد ایوب میں نانی مرحومہ کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔

''عزیز محترم نے اپنے نانا کی شخصیت کے ساتھ اپنی نانی مرحومہ کا ذکر بھی بہت خوبصورت اور پر اثر انداز سے کیا ہے۔ جن کا بھرپور تعاون حکیم صاحب کو حاصل رہا اور جنھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر حکیم صاحب کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی خوبیوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ یہ ۱۹۸۸ء کی بات ہے میں اپنی اہلیہ محترمہ زاہدہ بنت عبدالجلیل ندویؒ اور تین بچوں احمد، فاطمہ اور اسعد سلمھم اللہ کے ساتھ حکیم صاحب کے دولت خانے پہنچا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ نے جس اپنائیت خلوص ومحبت اور شفقت واحترام کا برتاؤ کیا وہ ہمیشہ کے لئے ان کے دل ودماغ پر نقش ہو گیا آج بھی جب حکیم صاحب ذکر خیر ہوتا ہے تو آپ کی اہلیہ محترمہ کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ عطا فرمائے''۔

ہمارے والد جناب ڈاکٹر علاؤالدین صاحب اور ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب کے درمیان بھی بہت گہرے تعلقات تھے۔ ڈاکٹر صاحب والد صاحب کو چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ اور ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے۔ اکثر فون پر والد صاحب سے گفتگو کرتے تھے اور اپنی گھریلو باتیں ان سے شیئر کرتے تھے۔ والد صاحب نے کئی مرتبہ حج اور عمرہ کے اسفار کے دوران ڈاکٹر صاحب کی میزبانی کا لطف اٹھایا ہے۔ جب بھی ڈاکٹر صاحبؒ کی کوئی نئی کتاب طبع ہوتی اس کے کئی نسخے والد صاحب کو ارسال کرتے اور ہدایت کرتے کہ انھیں گھر کے افراد اور جاننے والوں میں بطور ہدیہ تقسیم کریں۔ دونوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت جاننے کے لئے ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ چالیس سال پہلے کی بات ہے اس وقت ہندوستان میں پرنٹنگ کی کوالٹی اچھی نہیں ہوتی تھی۔ کاغذ بھی اچھا نہیں استعمال ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب جس لیٹر پیڈ پر خط بھیجتے تھے اس میں حروف ابھرے ابھرے ہوتے اور کاغذ بہت نفیس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آئے تو والد صاحب نے لیٹر پیڈ کی تعریف کردی۔ چند مہینے بعد بلریا گنج سے گئے ایک حاجی صاحب کے بدست ایک پیکٹ موصول ہوا۔ ویسا ہی لیٹر پیڈ تھا۔ وہی کاغذ، وہی رنگ، وہی ڈیزائن بس نام اور پتہ والد صاحب کا تھا۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب کے نانا کے تعلق کے سلسلے میں ایک اہم نام جناب منشی محمد انور صاحب کا بھی آتا ہے جو کہ نانا کے بیحد معتمد رفیق تھے۔ منشی محمد انور صاحب ڈاکٹر صاحب کی آمد کے موقعہ پر استقبال سے لے کر الوداع تک کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو پریشانی نہ ہو اس لئے کوشش کرتے کہ ان کی ملاقاتوں وغیرہ کا انتظام خود دیکھیں۔ اوپر میں نے ذکر کیا ہے کہ عمر آباد سے آمد کے موقعہ پر ڈاکٹر صاحب کو لینے کے لئے وہ یکہ پر جا رہے تھے۔ دس سال بعد جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو منشی محمد انور صاحب ہی ان کو لینے بنارس ایرپورٹ گئے تھے۔ گاڑی سے خود ڈرائیو کر کے گھر لائے۔ زمانے نے ترقی کر لی تھی یکہ کی جگہ کار نے لے لی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے جب اپنے آبائی گھر کی تعمیر نو کروائی تو ان کی خواہش پر تعمیر کی پوری ذمہ داری منشی محمد انور صاحب نے اپنے ذمے لی تھی۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب نے نانا مرحوم کے گھر سے دیرینہ تعلق کو نبھانے کی ساری عمر کوشش کی۔ ان کی خواہش رہتی کہ نانا کے تعلق سے مدینہ منورہ آنے والے افراد ان کے یہاں قیام کریں۔ ظاہر سی بات ہے یہ ممکن نہیں ہے کیوں کہ وہاں پہنچنے والے ہر بشر کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اپنا زیادہ وقت حرم نبوی میں گزارے۔ ڈاکٹر صاحب مصر رہتے کہ گھر سے آنے والے جب تک مدینہ میں مقیم ہیں رات کا کھانا ان کے یہاں کھائیں یا کم از کم ایک مرتبہ ان کے یہاں کھانے پر ضرور آئیں۔ ہمارے والدین جب پہلی مرتبہ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے انھیں باصرار اپنے گھر پر رکھا اور پورے قیام مدینہ کے دوران خود کار ڈرائیو کر کے بعد نماز عشاء گھر لے جاتے اور فجر کے وقت مسجد نبوی واپس چھوڑتے۔ حالانکہ اس وقت وہ پروفیسر ہو چکے تھے۔ ہمارے چھوٹے ماموں ڈاکٹر عمیر احمد صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے۔ ان کی شکل اور بہت سی عادات حیرت انگیز طور پر نانا مرحوم سے ملتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ مدینہ میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تم روز رات کا کھانا گھر پر کھانا۔ میں گاڑی بھیج دوں گا تم عشاء کی نماز کے بعد آجانا۔ انھوں نے تکلف کیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نہ مانے۔ کہنے لگے تم کو دیکھ کر مجھے حکیم صاحبؒ کی یاد آتی ہے۔ آجایا کرو، اچھا لگتا ہے۔ اب انکار کی کیا گنجائش تھی۔

بہت سارے واقعات ہیں ان گنت مثالیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نانا مرحوم کے گھر کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھا اور خود کو گھر کا حصہ۔ اس تعلق کو ساری عمر نبھاتے رہے۔ دوسری طرف بھی یہی حال تھا۔ دونوں طرف سے تعلقات بے لوث رہے اس لئے شاید ساٹھ سال سے قائم و دائم ہیں۔

بلریا گنج کے فرزند:

ڈاکٹر صاحب کو حالات کے پیش نظر وطن سے ہجرت کرنی پڑی لیکن وہ اپنے آبائی وطن اور وہاں کے لوگوں کو کبھی نہیں بھولے۔ وہ فرزند بلریا گنج تھے۔ یہاں کی مٹی سے اٹھے تھے۔ انھیں یہاں کی سرزمین، یہاں کے لوگوں سے لگاؤ تھا۔ اپنے لوگوں سے ملاقات کے وقت وہ اپنے بچپن کے دنوں کا تذکرہ کرتے۔ پرانے دوستوں کو یاد کرتے۔ ان کے بچپن کے زیادہ تر ساتھی مسلمان تھے جن کو وہ بھولے نہیں تھے۔ ملنے پر پہچان لیتے تھے۔ ان کے پرانے دوستوں اور واقف کاروں کی سعودی عرب میں مقیم اولادیں ہمیشہ ان کی توجہ کا مرکز رہیں۔ ان سے مل کر ان کو اپنے یہاں مدعو کر کے ان کو خوشی ہوتی۔ گاؤں سے حج کی ادائیگی کے لئے تشریف لے جانے والے حجاج کرام کو اپنے گھر مدعو کرنا اور ان کی ضیافت کرنا ان کی عادت تھی۔ حج سے لوٹنے والی خواتین عرصے تک شان سے بیان کرتیں کی ایک دن ضیاء الرحمٰن صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب وہ مکہ مکرمہ میں رہتے تھے۔ ان کے مدینہ منورہ منتقل ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ بلریا گنج میں جب کوئی اجتماعی سرگرمی ہوتی جیسے مسجد کی تعمیر وغیرہ تو منتظمین ان تک ضرور اطلاع پہنچاتے اور وہ حسب استطاعت اپنا حصہ ڈالتے۔

بلریا گنج سے ان کے تعلق کے سلسلے میں ایک اہم واقعے کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کے کردار کا ایک اہم پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ وہ ہے خودداری اور عزت نفس کا پاس۔ ڈاکٹر صاحب جب عمر آباد سے تعلیم مکمل کر کے واپس آئے تو گاؤں کے چند سر برآوردہ لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ضیاء الرحمٰن صاحب نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہے اس لئے ہم مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھیں۔ ایک تجویز یہ پیش کی گئی گاؤں کے خوشحال افراد ان کو سلسلہ وار کھانے

پر مدعو کریں، دوسری تجویز یہ تھی کہ گاؤں کے لوگ باہمی تعاون سے ان کا مکان تعمیر کرائیں۔ رشتے کی بھی پیشکش ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بعض تفصیلات مجھے خود بتائیں اور بعض دوسرے مصدقہ ذرائع سے معلوم ہوئیں۔ کہتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ لوگ میری بھی سنیں گے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کسی سے کسی قسم کا تعاون نہیں لوں گا۔ اور نہ ہی ابھی کسی خانگی ذمہ داریوں میں پڑوں گا۔ ابھی مجھے آگے پڑھنا ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کی سمت اسی دن طے ہوگئی تھی۔ ان کا احساس رہا ہوگا کہ یہ تمام پیشکش ان سے ہمدردی کے نتیجے میں ہے۔ ان کی عزت نفس نے گوارہ نہ کیا کہ کسی کا احسان قبول کریں۔ اس واقعے کے کچھ دنوں کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے سعودی عرب چلے گئے اور ان کا بلریا گنج سے مادی تعلق ٹوٹ گیا۔ یہ ان کی ہجرت کا آغاز تھا۔ حصول دین کے لئے سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کرنے کے طفیل میں اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ عزت اور مقبولیت عطا فرمائی جس کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

نام ونمود سے گریز:

ڈاکٹر صاحب کو یہ بات بہت ناپسند تھی کہ ان کی خدمات کی تشہیر کی جائے یا ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی ایسی بات لکھی جائے جس سے خودنمائی اور تعلّی کی بو آئے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کو صرف ان کے علمی کاموں کے حوالے سے جانا جائے اور وہ اس کی ہدایت بھی کرتے تھے۔ جناب عرفان صدیقی صاحب پڑوسی ملک کے مشہور کالم نگار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پر ان کا نہایت خوبصورت اور دل کو چھو لینے والا کالم روزنامہ جنگ میں شائع ہوا ہے۔ ''بلریا گنج سے جنت البقیع تک''۔ اس کالم میں انھوں نے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو ڈاکٹر صاحب نے ان کو لکھا تھا۔

''آپ اور دیگر حضرات سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ میرے متعلق جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے وہ بہت کافی ہے۔ اب مزید کچھ نہ لکھیں۔ ''کیوں کہ اس سے نفس میں عجب، غرور، تکبر داخل ہو جاتا ہے''۔

اس خوبصورت کالم کا ایک اقتباس اس مضمون کے آخر میں شامل ہے۔

کچھ عرصے قبل میں نے ڈاکٹر صاحب سے متعلق ایک مضمون سوشل میڈیا پر دیکھا۔ مجھے بعض باتیں مبالغے پر مبنی لگیں۔ ڈاکٹر صاحب سے خود پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ والد صاحب سے کہا آپ پوچھ لیں۔ والد صاحب نے وہ مضمون ان کو بھیج دیا۔ پہلی مرتبہ ہوا کہ فون کرنے کے بجائے صوتی پیغام بھیجا۔ والد صاحب نے وہ پیغام مجھے بھیج دیا۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ میرے بارے میں لوگ بہت کچھ لکھتے ہیں جس میں کچھ باتیں غلط ہیں۔ میں لوگوں سے کہتا ہوں میرے بارے میں مت لکھیں لوگ نہیں مانتے۔ میرے سینے میں بہت سارے راز دفن ہیں۔ کبھی موقعہ ملا تو خود لکھوں گا"

افسوس کہ وہ راز راز ہی رہ گئے۔ اور ہم ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی بہت کچھ نہیں جان سکے اور جو جانتے بھی ہیں وہ لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے کہ کیسے لکھیں ڈاکٹر کو یہ سب پسند نہیں تھا۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی صاحبؒ میری نظر میں:

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب کو پہلی مرتبہ میں نے غالباً ۱۹۷۸ء میں دیکھا تھا۔ وہ کافی عرصے کے بعد بلریا گنج اپنے والدین سے ملنے آئے تھے اور نانا مرحوم جناب حکیم محمد ایوب صاحبؒ کے یہاں ٹھہرے تھے۔ چند روز رہ کر وہ واپس سعودی عرب چلے گئے جہاں اس وقت وہ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ میں اس وقت کم سن تھا اس لئے ان کی مجالس تک رسائی نہ ہو سکی۔ دور سے ہی دیکھا کئے۔ اگلے سال عید کے موقعہ پر وہ دوبارہ آئے اور لگ بھگ ایک ہفتے تک قیام کیا۔ اس سال انھوں نے عید کی نماز بھی پڑھائی تھی جس کا پورے علاقے میں چرچا تھا۔ اس مرتبہ مجھے ان کی مجالس میں بیٹھنے اور ان سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کے پر وقار انداز، پر اعتماد لہجے اور گفتگو کے انداز نے مجھے کم سنی میں اتنا متاثر کیا کہ ساری عمر اس کے سحر سے باہر نہ نکل سکا۔ وہ مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ پہلی ملاقات کے بعد سے ہی مجھے ان کی توجہ حاصل رہی۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ میری تعلیم کے سلسلے میں برابر رہنمائی اور ہمت افزائی کرتے رہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ جب میں ان سے

پہلی مرتبہ ملا تھا تو میری عمر لگ بھگ دس سال تھی اور وہ مجھے گھر کے نام سے پکارتے تھے۔ چار عشرے گزرنے کے بعد بھی کبھی انھوں نے مجھے میرے اصلی نام سے نہیں پکارا۔ بچپن کے گھر کے نام سے بلاتے تھے۔ جب بھی فون کیا پرتپاک لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں پپو کیسے ہو''۔

چند سال قبل میں نے نانا مرحوم پر اپنی یادداشتیں ترتیب دیں۔ مقدمہ لکھنے کے لئے کس سے کہوں۔ ان سے زیادہ مناسب کوئی نام ذہن میں نہیں آیا۔ سوچا مشغول رہتے ہیں کہاں موقعہ ہوگا۔ ڈرتے ڈرتے فون کیا۔ فوراً تیار ہو گئے اور ایک بیحد خوبصورت مقدمہ تحریر کیا۔ تحریر اتنی دلکش جیسے دل سے لکھا ہو۔ ان کے ساتھ میری بے حد قیمتی یادیں جڑی ہیں۔ میں نے انھیں بے حد سادہ انسان پایا۔ ایک ایسا شخص جس میں کوئی تصنع نہیں۔ کسی بھی قسم کے افراط وتفریط سے دور۔ دوسروں کا احترام کرنے والا۔ رشتے اور تعلقات نبھانے والا۔ یہ میری کم علمی کہیں یا کم عقلی کہ میں نے کبھی ان کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا کہ وہ کتنی کتابوں کے مصنف ہیں، مدینہ یونیورسٹی میں ڈین فیکلٹی آف حدیث ہیں، رابطہ عالم اسلامی میں اعلی عہدے پر فائز ہیں۔ مجھے تو وہ ڈاکٹر ضیاء اچھے لگے۔ جب انھوں نے بنارس ایرپورٹ سے گھر آتے ہوئے چندوک بازار میں گاڑی رکوا کر میٹھا سموسہ کھانے کی فرمائش کی۔ بولے مجھے بچپن سے پسند ہیں۔

ان کے ساتھ دلی کے کناٹ پلیس بازار میں ٹہلنا اور باٹا کے شوروم سے جوتا لینا یاد آتا ہے۔ جب مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ جیب میں پیسہ ہو اور شخصیت پر وقار ہو تو کارپوریٹ کلاس کیسے جھکتا ہے۔ یا پھر برسات کی وہ شام جب کناٹ سرکس کی راہداریوں میں ٹہلتے ٹہلتے ہم جن پتھ مارکیٹ جا نکلے تھے اور وہاں کے ایک ریسٹورنٹ دی ٹریٹ، میں شام کا ناشتہ کیا تھا۔ پتہ نہیں اب وہ ریسٹورنٹ ہے بھی کہ بند ہو گیا۔ مجھے وہ ریسٹورنٹ اس لئے یاد ہے کیوں کہ اکثر ادھر سے گزرتے وقت باہر سے جھانک لیتے تھے اندر جانے کی ہمت نہیں ہوتی کہ پتہ نہیں کتنا مہنگا ہوگا۔ یا پھر مرینہ ہوٹل (جہاں وہ رکے تھے) کا ریسٹورنٹ میزبان جہاں وہ مجھے اور ہمارے ماموں ڈاکٹر جاوید احمد صاحب کو ڈنر کے لیے لے گئے تھے۔ ہم ان سے علی گڑھ سے ملنے آئے تھے۔ کھانے کا بل میں نے چپکے سے دیکھ لیا تھا۔ دوسو پچاس روپے کچھ پیسے۔ اس وقت

علی گڑھ میں ہمارا میس کا مہینے کا بل ایک سوتیں روپے تھا۔ بنارس جامعہ سلفیہ کے عالی شان مہمان خانے کی وہ شام جب میں گھر سے ان سے ملنے آیا تھا۔ وہ کسی پروگرام کے سلسلے میں مدینہ یونیورسٹی کے ایک وفد کے ساتھ آئے تھے اور وہاں مقیم تھے۔ مجھے اگلے دن ندوۃ العلماء لکھنؤ جانا تھا۔ ان کو اداس دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا۔ کہنے لگے پپو ایسے ہی زندگی گزرتی ہے۔ ہوٹلوں میں، اجنبی جگہوں پر۔ تب مجھے احساس نہیں تھا، ہوٹل، ایرپورٹ، گاڑی کے سفر مجھے مسحور کن لگتے تھے۔ سن کر عجیب سا لگا۔ آج کبھی کسی اجنبی جگہ، کسی ہوٹل کے کمرے میں، کسی ایرپورٹ پر جب اداسی اور تنہائی گھیرتی ہے تو مجھے وہ لمحہ یاد آتا ہے۔

مجھے لگا کہ ہم نے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب کی زندگی کے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے اندر کے انسان کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی کہ اندر سے وہ عام سے انسان تھے، ایک ماں کا لاڈلا بیٹا، باپ کا سہارا، بہنوں کا بھائی۔ ایک شفیق باپ۔ ایک پیار کرنے والا شوہر۔ جسے اپنے لوگوں، اپنی مٹی سے پیار تھا۔ جو پاک سرزمین عرب میں رہتے ہوئے بھی ان کھیتوں کھلیانوں کو یاد کرتا تھا جہاں اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ جسے اپنے بچپن کے دوستوں کے نام یاد تھے۔ جو چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہوتا تھا۔

پہلی مرتبہ مجھے بہت تعجب ہوا جب ان کے والد واپسی کے سفر کے وقت ایک پیکٹ میں کچھ سامان لائے۔ میں نے پوچھا کیا ہے۔ بولے سون پاپڑی ہے جھمرکی، بابو کو بہت پسند ہے۔ بچپن میں شوق سے کھاتے تھے۔ زیادہ تعجب اس وقت ہوا جب مدینہ یونیورسٹی کے ڈین فیکلٹی آف حدیث نے وہ سون پاپڑی اپنے قیمتی امریکن ٹورسٹر کے سوٹ کیس میں رکھ بھی لی۔ چند سال قبل دیکھا کہ ان کا بھانجا جس کی پولیو سے ٹانگیں مفلوج ہیں گھر سے حج پر جانے والے کے ہاتھ بھیجنے کے لئے جھمرکی سون پاپڑی لایا ہے۔ کہ ماما کو دے دیجئے گا۔ والد نہیں رہے۔ ذمہ داری بھانجے نے لے لی تھی، میں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ ان کے گھر کے آنگن میں چارپائی پر پھول والی چادر بچھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھے ہیں آگے پیچھے سب بہنیں اور ان کی اولادیں بیٹھی ہیں۔ ماں لاڈ سے تحکمانہ لہجے میں کہہ رہی ہیں کہ بہنوں اور ان کے بچوں کے لئے یہ بنوادو۔ ڈاکٹر صاحب سعادت مندی سے کہتے ہیں ہاں ہوجائے گا۔ ماں کے

چہرے پر عجب سی خوشی آجاتی ہے۔ناز کا احساس۔باہر نکلنے کے بعد ڈاکٹر صاحب دھیرے سے مجھ سے کہتے ہیں کہ چھوٹی بہن کو ماں زیادہ مانتی ہے۔یاللعجب۔ایک بہن کا لڑکا ان کے پاس آکر کان میں کچھ کہتا ہے۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں ٹھیک ہے۔سائیکل کی فرمائش ہے۔مجھ سے کہتے ہیں کہ دیکھ لینا۔اگلے روز بل دیتے وقت معلوم ہوا کہ سائیکل کا ریٹ کافی زیادہ ہے۔پتہ چلا کہ سب سے مہنگی سائیکل تیار کروائی ہے، لائٹ وغیرہ کے ساتھ۔دوسری بہن کا لڑکا ضد کرتا ہے کہ مجھ کو بھی چاہیے۔بالکل روایتی مشرقی اترپردیش کا ماحول۔مجھے لگا کہ ڈاکٹر صاحب کو اس ماحول میں آکر کتنا اچھا لگتا ہوگا۔

مہکتے پھول:

جولائی سنہ دو ہزار اگیارہ میں ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔اور یہ ملاقات بھی تقریباً سترہ سال بعد ہوئی تھی۔میں شارجہ سے اہلیہ اور بچوں کے ساتھ عمرہ کے لئے آیا تھا۔عمرے کی ادائیگی کے بعد مسجد نبوی شریف کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا اور کہا کہ میں گھر پر حاضر ہوں گا۔کہنے لگے کل شام میں آجاؤ۔عشاء کے بعد مسجد کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں اسعد (ڈاکٹر صاحب کے منجھلے بیٹے) تم سے ملیں گے وہ گھر لے کر آجائیں گے۔تم ٹیکسی سے نہیں پہنچ پاؤ گے۔عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تو فون کی گھنٹی بجی۔ڈاکٹر صاحب تھے پوچھ رہے تھے کہ تم کہاں ہو، میں مسجد نبوی کے گیٹ نمبر .... پر بیٹھا ہوں۔میں بھاگتے ہوئے پہنچا۔سلام کیا اور چھوٹتے ہی کہا میں کل آتا تو ملاقات ہوجاتی آپ نے کیوں تکلیف کی۔بولے تم کل ملنے آؤگے آج میں تم لوگوں سے ملنے چلا آیا۔اگلے روز عشاء کی نماز کے بعد ڈاکٹر اسعد ہمیں لے کر گھر پہنچے۔ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے احمد اور چھوٹے بیٹے اسید سلمہم اللہ بھی موجود تھے۔مدینہ منورہ میں ان کا ذاتی مکان تھا جو انھوں نے برسوں پہلے بڑے چاؤ سے بنوایا تھا۔رسول اللہ ﷺ کے شہر کے اس مکان میں گزرے چند گھنٹے ساری زندگی یاد رہیں گے۔کھانے کے بعد ہم ان کی لائبریری میں آگئے۔ان دنوں وہ الجامع الکامل پر کام کررہے تھے۔کمرے میں جگہ جگہ مسودے کے کاغذات فائلوں میں رکھے تھے۔میں نے حیرت سے پوچھا

آپ ابھی بھی کاغذات پر لکھتے ہیں۔کمپیوٹرنہیں استعمال کرتے ،احادیث کیسے تلاش کرتے ہیں۔ کہنے لگے ہمارے اپنے طریقے ہیں احادیث کی تخریج کے۔کمپیوٹر کی کیا ضرورت۔ باتیں ہوتی رہیں۔الجامع الکامل کو لے کر بہت حوصلے میں تھے۔ رات زیادہ ہونے لگی تو میں نے اجازت چاہی۔ گھر سے باہر نکلے تو سامنے صحن میں پھولوں کے پودے قطار سے لگے تھے۔انھوں نے بیل کے ایک پودے سے سفید پھول توڑے اور چلتے چلتے میرے ہاتھ میں دے دیا۔گاڑی میں بیل کے سفید پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دیر تک مہکتی رہی۔ میں یہ پھول اپنے ساتھ شارجہ لایا اور کسی کتاب میں رکھ دیا۔ جب رحلت کی خبر سنی تو وہ پھول یاد آئے۔ یادنہیں آرہا ہے کہ کہاں رکھا تھا۔ اب تو سوکھ بھی گئے ہوں گے۔مہک بھی باقی نہیں ہوگی۔لیکن بلریا گنج کے گل کی خوشبو جو مدینہ منورہ کے گلزار میں مہکا شاید کبھی بھی زائل نہ ہو۔بلریا گنج سے مدینہ جانے والے زائرین یہ خوشبو ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے۔

بلریا گنج سے جنت البقیع تک:

بلریا گنج سے مدینۃ النبی ﷺ تک پھیلی مُشکبو کہانی کا باب تمام ہوا۔’’بانکے لال‘‘ اپنے عہد کا سب سے بڑا محدث بن کر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کے نام سے وہاں چلا گیا جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ ۳۰رجولائی یوم الحج نماز مغرب کے بعد مسجد نبوی میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ وہی مسجد نبوی جہاں وہ برسوں سے احادیث کا درس دے رہے تھے۔’’بلریا گنج‘‘ کی مٹی، جاودانی رفعتوں سے ہم کنار ہو کر جنت البقیع کی کہکشاں میں جذب ہوگئی۔نہیں معلوم ان کی قبر جنت البقیع کے کس منطقے میں بنی جہاں صحابہ کرامؓ، صحابیاتؓ، اہل بیتؓ اور حضور ﷺ کے جگر گوشوں سمیت دس ہزار سے زائد پاک ہستیاں آسودۂ خاک ہیں۔جانے ان کی قبر کو کس کی ہمسائیگی کا شرف ملا۔ جانے جنت البقیع میں سپرد خاک ہونے والے ضیاء الرحمٰن کی روح کس دروازے سے جنت الفردوس میں داخل ہوئی ہوگی؟ جانے اس کا استقبال کس طرح کیا گیا ہوگا لیکن موسم بہار کی ’’شبنمی چھایا‘‘ جیسا یہ خیال دل و دماغ میں ہلکورے لیتا رہتا ہے۔کیا خبر نبی کریم ﷺ نے آغوش رحمت وا کرتے ہوئے فرمایا ہو’’ضیاء الرحمٰن تو میرا ہے‘‘

نوٹ:

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر یہ ایک تاثراتی مضمون ہے جو ان کے بلریا گنج سے تعلق کے پس منظر میں ان احباب کے استفادے کے لئے تحریر کیا گیا ہے جو ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ دیگر مقامات کی تفصیلات جہاں ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ نے بیرون ملک جانے سے قبل قیام کیا تھا یا بیرون ملک قیام کی تفصیلات اس مضمون کے احاطہ تحریر سے باہر ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کے علمی و تحقیقی کارناموں کی تفصیلات کا جائزہ بھی اس مضمون میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ تفصیلات بہت سارے دیگر ذرائع سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مضمون کی تیاری میں پوری احتیاط برتی گئی ہے کہ صرف درست معلومات ہی شامل کی جائیں۔ کسی بھی قسم کی مبالغہ آرائی سے گریز کیا گیا ہے۔ بعض باتیں نہایت ذاتی نوعیت کی ہیں جنھیں نہ چاہتے ہوئے بھی بعض قریبی احباب کے اصرار پر شامل کیا گیا ہے۔

حالیہ دنوں میں ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کے قیام بلریا گنج کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لئے دنیا بھر سے لوگ رابطہ کر رہے ہیں۔ ایسے احباب کی تشنگی شاید اس مضمون سے پوری ہو سکے۔ بہت سارے احباب تحقیقی مقالات کے لئے ان معلومات کے مصادر بھی جاننے چاہیں گے۔ چونکہ راقم خود تحقیق کے مرحلے سے گزر چکا ہے اس لئے کوشش کی ہے کہ تمام معلومات تحقیق کے معیار پر پوری اتر سکیں۔ تحریر کی گئی معلومات ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب کے انٹرویوز، ذاتی یادداشتوں اور معتبر شخصی ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں۔ تحقیقی مقالات لکھنے والے اعتماد سے ان معلومات کے حوالے دے سکتے ہیں۔ مزید تحقیق کے لئے ای میل پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کی داستان عزیمت کے بہت سارے کردار اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کچھ اہم کردار ایسے ہیں جن کی یادداشت بہت کمزور ہو چکی ہے۔ میں نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی مفید معلومات نہیں مل سکیں۔ میری معلومات کے ذرائع ایسی بزرگ خواتین کی گفتگو بھی ہے جن کے گھر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کے گھر سے متصل تھے اور انھوں نے بہت قریب سے ان واقعات کو دیکھا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر اب بقید حیات نہیں ہیں لیکن وہ عرصے تک یہ باتیں بتاتی رہتی تھیں۔ ایسی بہت ساری گفتگو میں نے بچپن میں خود اپنے کانوں سے سنی ہیں۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ایسی تمام معلومات کراس چیک کر کے شامل کی جائیں۔ میں خود ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ سے لگ بھگ چالیس سال سے قریب رہا ہوں اور مسلسل دس سال تعطیلات میں ان کی آمد کے موقع پر

ان کے ساتھ رہا ہوں۔ مجھ سے انھوں نے خود بہت ساری باتیں بتائی ہیں۔لیکن بعض باتیں ذاتی نوعیت کی ہیں جن کو میں تحریر نہیں کرسکتا۔ بہت ساری باتیں میں نے اپنے نانا محترم حکیم محمد ایوب صاحبؒ کی مجلسوں میں سنی ہیں اوران کی تصدیق خود ڈاکٹر صاحب سے کرلی تھی۔ ہمارے والد ڈاکٹر علاؤ الدین صاحب سے بھی ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ بہت ساری باتیں شیئر کرتے تھے۔لیکن بعض باتیں ذاتی نوعیت کی ہوتی تھیں۔اس لئے انھیں ضابطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔البتہ بین السطور کچھ باتیں بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کے بچپن، قبول اسلام، اور ہجرت کے تعلق سے بلریا گنج اور اطراف میں بہت ساری باتیں افسانوی طور پر گردش کرتی رہیں ہیں۔جن میں سے اکثر بے بنیاد یا مبالغے پر مبنی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ اکثر اس بات پر دکھ کا اظہار کرتے تھے جس کا حوالہ میں نے اوپر دیا ہے۔ایک اہم بات ان کی برادری سے متعلق سوشل میڈیا پر چل رہی گفتگو ہے۔میرے نزدیک ان کی برادری کی تحقیق کا ان کی عزیمت کی داستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر بھی ریکارڈ کی درستگی کے لئے عرض ہے کہ ان کا تعلق دھوبی برادری سے تھا۔لیکن ان کے گھر یہ کام نہیں ہوتا تھا۔ ان کے والد کا کلکتہ میں کاروبار تھا۔وہ کافی خوشحال تھے اوراپنی برادری کے چودھری کہے جاتے تھے۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کے سفر ہدایت کے تعلق سے بھی بعض باتیں مبالغے پر مبنی ہیں۔ان کے قبول اسلام کے تعلق سے میرا اپنا تجزیہ ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔نانا محترم جناب حکیم محمد ایوب صاحبؒ جن کا نام ان کے قبول اسلام کے حوالے سے آتا ہے سے کشیدہ میری معلومات کے مطابق انھوں نے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کو اسلام سے قریب کرنے کے لئے دعوتی کوشش کا آغاز نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود اسلام کو جاننا چاہتے تھے اور چل کر ان کے پاس آئے تھے۔چونکہ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ کا گھر ماسٹر جنید صاحبؒ کے گھر کے ٹھیک سامنے تھا اس لئے وہ اکثر ماسٹر صاحب کی بیٹھک میں آکر بیٹھتے تھے اور ماسٹر صاحب سے دوستی کی وجہ سے ان سے بے تکلف تھے۔اوران سے اکثر اسلام کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب کے مطابق میں نے ایک دن کہا کہ آپ سوال بہت کرتے ہیں۔حکیم جی کے یہاں چلتے ہیں وہ آپ کے سوالات کا جواب دیں گے۔ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحبؒ نے مقدمہ تذکرہ حکیم محمد ایوبؒ میں اس کا ذکر کیا ہے۔اوریہیں سے ان کے سفر ہدایت کا آغاز ہوتا ہے۔

مراجع :

انٹرویو ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی ''پروفیسر الیف الدین ترابی'' اردو ڈائجسٹ لاہور ۱۹۷۸ء
انٹرویو ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی ''ڈاکٹر یاسر قاضی'' یوٹیوب
''بلریا گنج سے جنت البقیع تک'' عرفان صدیقی، روزنامہ جنگ ۴/اگست ۲۰۲۰ء
''تذکرہ حکیم محمد ایوبؒ'' صباح الدین اعظمی۔ حکیم محمد ایوب ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، بلریا گنج
بعض اہم افراد سے ٹیلیفونک انٹرویوز
مضمون نگار کی ذاتی یادداشتیں، ذاتی خطوط

مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

tazkirahhmayyub@gmail.com

ڈاکٹر صباح الدین اعظمی
۷/اگست/۲۰۲۰ء

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ایک نظر میں

پیدائش: بلریا گنج، اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء

تعلیم:

ابتدائی تعلیم: شبلی کالج، اعظم گڑھ

عالمیت، فضیلت، جامعہ دار السلام، عمر آباد

گریجویشن: الجامعہ الاسلامیہ، مدینہ منورہ

ماسٹر: جامعۃ الملک عبد العزیز، مکۃ المکرمہ، جواب جامعۃ ام القری کے نام سے جانی جاتی ہے۔

ڈاکٹریٹ: جامعہ الازھر، مصر

مناصب:

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں مختلف مناصب پر فائز رہے، اور آخر میں انچارج ہیڈ آفس جنرل سیکریٹری (مدیر مکتب الامین العالم لرابطہ العالم الاسلامی) رہے۔

تعلیم و تدریس:

۱۹۷۹ء میں جامعہ الاسلامیہ میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر متعین ہوئے۔

ڈاکٹریٹ کے مقالوں کی نگرانی اور ان کے مناقشے

ادارتی ذمہ داری

مدیر البحث العلمی

مدیر مکتب الجالیات التابعۃ للجامعۃ الاسلامیہ

رکن مجلۃ الجامعۃ الاسلامیہ

رکن مجلس الجامعۃ الاسلامیہ

رکن مجلس علمی الجامعۃ الاسلامیہ

عمید کلیہ الحدیث

علمی دروس: مسجد نبوی میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے دروس

وفات: مدینہ منورہ، ۳۰ر جولائی ۲۰۲۰ء

تدفین: جنت البقیع

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ: تصانیف

عربی تصانیف:

أبوهريرة فى ضوء مروياته

أقضية رسول الله صلى الله عليه وسلم لابن الطلاع

د راسات فى الجرح والتعد يل

المدخل الى السنن الكبرىٰ للبيهقى

د راسات فى اليهودية والنصرانية

فصول فى أديان الهند

فتح الغفور فى وضع الأيد ى على الصد ور للعلامة محمد حياة السندى

ثلاثة مجالس من أمالى ابن مردويه

معجم مصطلحات الحد يث ولطائف الأسانيد

المنة الكبرىٰ شرح وتخريج السنن الصغرى للحافظ البيهقى

التمسک بالسنة فى العقائد والأحكام

تحفة المتقين فى ماصح من الاذكار والرقى والطب عن سيد المرسلين

الجامع الكامل فى الحديث الصحيح الشامل

الأدب العالى

اردو، ہندی تصانیف

اتباع سنت عقائد اور احکام میں

قرآن کریم کی شیتل چھایا۔

قرآن مجید کی انسائیکلوپیڈیا